© rasailojaraid.com

پروفیسر خالد شبیر احمد　　　　قسط:۲۹

ورق ورق زندگی

امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے میں شرکت:

اگست ۱۹۶۱ء گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا کہ ۲۱ راگست کی شام کو میرے چھوٹے بھائی باقر صغیر احمد گھر آئے اورانہوں نے مجھے بتایا کہ شہر میں یہ خبر عام ہے کہ شاہ جی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ کئی لوگوں سے ملا ہوں یہی اطلاع ملی ہے اوراس پر سبھی پریشان بھی ہیں۔ میں نے بھی یہ خبر سنی اور دل نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ واقعی اب امیر شریعت ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔ اخبارات میں ایک تسلسل کے ساتھ اُن کی صحت کے بارے میں چھپ رہا تھا خود اس وقت کے پاکستان کے صدر ایوب خان کا ایک بیان بھی نظر سے گزرا جس میں اُن کی جنگ آزادی میں خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں ہر ممکن طبی امداد مہیا کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اس بات کی ذہن سازی کر رہا تھا کہ یہ عظیم و بے مثال ہستی اب ہمارے درمیان بہت زیادہ دیر کے لیے نہیں ہے۔ میں سن کر انتہائی غمگین اور پریشان ہوا اور یہ بات ایک فطری امر تھا۔ جو تعلق خاطر ان سے قائم ہو چکا تھا اس کے پیشِ نظر پریشانی ایک لازمی امر تھا۔ گھر میں والدہ محترمہ نے کہا کہ مجھے دھوبی گھاٹ تمہارے چچا کے ہاں جانا ہے تم میرے ساتھ چلو۔ میں چھوٹے بھائی ظہیر کو ساتھ لے کر دھوبی گھاٹ آ گیا۔ لیکن ذہن میں وہی کھلبلی سی مچی ہوئی تھی کہ شاہ جی کی صحت کے بارے میں پتہ چلے۔ والدہ کو چچا جان کے گھر پہنچا کر دھوبی گھاٹ کی مسجد میں نماز عشاء ادا کرنے کے لیے آیا۔ چھوٹا بھائی ظہیر میرے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا ایک جلسہ ہو رہا ہے مگر آدمی دس بارہ ہی بیٹھے ہیں ایک صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ میں نے نمازِ عشا ادا کی تو دیکھا کہ جو صاحب تقریر کر رہے ہیں ان کے ساتھ حکیم عبدالمجید نابینا صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ حکیم صاحب والد صاحب کے دوست تھے۔ اکثر اُن کے مطب بھی جانا ہوتا تھا، امین پور بازار میں دفتر مجلس احرارِ اسلام کے نیچے مطب کرتے تھے۔ جبکہ اس وقت دفتر احرار میں مولانا عبدالرحیم اشعر آفس سیکرٹری کے طور پر کام کرتے تھے۔ میں نے جب حکیم صاحب کو دیکھا تو اُن کے پاس آ کر پوچھا کہ کیا ملتان سے شاہ جی کے بارے میں کوئی تازہ خبر آئی ہے۔ کہنے لگے کہ تم ابھی مسجد میں آئے ہو۔ میں نے کہا کہ جی ہاں میں تو ابھی آیا ہوں۔ کہنے لگے:

''شاہ جی تو ہمیں چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ یہ جلسہ اُن کی موت کی خبر سن کر ہی بے مزہ سا ہو گیا ہے، لوگ خبر سن کر گھروں کو چلے گئے۔ میں نے جلسے میں اُن کی وفات کا اعلان کرایا تھا۔''

اس جانکاہ اور جاں گداز خبر پر میں نے کیا سوچا اور کیا محسوس کیا یہ بات بیان نہیں ہو سکتی۔ بس ایک بے رنگی و بے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوتی جیسے ایک سناٹا یا جیسے خلا کی بے وزنی و بے استقراری۔ بس ایک ایسی کیفیت جسے خاموشی یا سکتہ کہا جاسکتا ہے۔ رونے کی طبیعت کو جیسے ضرورت ہی نہ ہو۔ مسجد سے نکلا، بھائی کو ساتھ لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن راہ میں ٹھان لی کہ اگر آج رات مجھے بھاگ کر بھی ملتان جانا پڑا تو میں بھاگ کر بھی ملتان جاؤں گا تاکہ اُن کے جنازے میں شرکت کر پاؤں۔ بس اسی سوچ میں گم چلا جارہا تھا کہ گھنٹہ گھر چوک میں مجھے میرے کالج کے ساتھی اور ہاکی کے گول کیپر جمیل بٹ مل گئے۔ اُنہیں علم تھا کہ میں حضرت امیر شریعت کا عقیدت مند ہوں۔ انہوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ یار شبیر حضرت امیر شریعت وفات پا گئے ہیں۔ میں نے ریڈیو سے یہ خبر سنی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ مجھے بھی علم تو ہو چکا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ملتان کیسے جاؤں۔ اس نے میری بات سن کر فوراً گھنٹہ گھر کے گھڑیال کی طرف دیکھا تقریباً رات کے دس بج رہے تھے۔ کہنے لگے یار تھوڑے سے تم لیٹ ہو گئے ہو وگرنہ رات دس بجے ایک گاڑی خانیوال جاتی ہے۔ فوری کہنے لگے کہ یہ گاڑی کون سی عین وقت پر ہی آتی جاتی ہے تمہیں ریلوے سٹیشن جا کر گاڑی پکڑنے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی، جمیل بٹ کہنے لگے کہ یہ کون سا مسئلہ ہے یہ دس روپے تمہارے آنے جانے کے لیے کافی رہیں گے۔ میں نے ان سے دس روپے لیے اور ریل بازار سے تانگہ پکڑا، رات کا وقت تھا اور یہ ۱۹۶۱ء کا لائل پور تھا۔ بازار خالی، گھوڑا یوں بھاگا کہ جیسے زمین پر نہیں ہوا میں اُڑ رہا ہے ہو اس پر بھی دل یہ چاہتا تھا کہ مزید تیز چلے۔ سٹیشن پر آ کر جب ٹکٹ کے لیے کلرک کو کہا تو اس نے مجھے ملتان کا ٹکٹ تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ گاڑی چھوٹنے والے ہے بھاگ کر گاڑی کو پکڑ سکتے ہو۔ بھائی ظہیر کو گھر بھیج دیا اور کہا کہ گھر کہہ دینا کہ میں ملتان میں شاہ جی کے جنازے میں شرکت کے لیے چلا گیا ہوں۔ پلیٹ فام پر قدم رکھا تو گاڑی آہستہ آہستہ چلنا شروع ہو گئی تھی جیسے میرے ہی انتظار میں رکی رہی ہو۔ رفتار ذرا تیز ہوئی تو میں بھاگا اور بھاگ کر ایک ڈبے کو جا پکڑا، یہ بڑا ڈبہ تھا جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور اتفاق یہ کہ سبھی احرار رضا کار میرے جاننے والے اور کچھ ایسے بھی تھے جو آشنا نہیں تھے اسی ڈبے میں تھے۔ ایک کونے میں مولانا تاج محمود صاحب بھی اور میرے قریبی دوست اقبال فیروز جو کالج سے ہی میرے دوست تھے (بعد میں اُن کے محفل ہوٹل میں برسوں بیٹھے) وہ بھی اس ڈبے میں تھے۔ گاڑی نے ذرا رفتار پکڑی تو ایک آدمی گاڑی پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن سانس اکھڑا ہوا تھا۔ مولانا تاج محمود نے کہا کہ اسے ہاتھ تھما کر پکڑ لو۔ چنانچہ چند ساتھیوں نے اسے کھینچ کر چلتی گاڑی میں بٹھایا لیکن وہ لیٹ گیا، سانس اکھڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا سانس بحال ہوا تو کہنے لگا کہ آپ لوگوں نے جو مجھ پر احسان کیا ہے میں عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔ میں تو ڈھڈھی والہ سے جو فیصل آباد کے ساتھ اس وقت ایک گاؤں تھا اس گاڑی کو پکڑنے کے لیے بھاگا ہوتا کہ شاہ جی کے جنازے میں شرکت کر سکوں۔

یہ عجیب بات تھی کہ ڈبے میں تمام لوگ تقریباً ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لیکن کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا جیسے سب سکتے میں ہوں۔ انتہائی سنسناتی ہوئی خاموشی تھی۔ میرے خیال میں ہم میں سے ہر ایک اس خاموشی میں شاہ جی کے ساتھ روپہلے بیتے لمحوں کی یاد میں مگن تھا، ان کی وفات کے غم میں خاموش رہنے کو ترجیح دے رہا تھا یا پھر اس غم کے بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے سرے سے الفاظ ہی نہیں تھے کہ غم کا اظہار کرسکیں۔ اسی حالت میں گاڑی نے ہمیں خانیوال پہنچایا تو ہم اُتر کر دوسرے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ جہاں سے ہم نے لاہور والی گاڑی پکڑنا تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہم لاہور سے آنے والی گاڑی میں سوار تھے۔ یہ گاڑی بھی پوری کی پوری امیر شریعت کے عقیدت مندوں اور احرار رضا کاران و رہنماؤں سے بھری ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ شورش کاشمیری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے احرار رہنما اسی گاڑی میں سوار ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ لاہور والی گاڑی میں بھی وہی خاموشی جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، کوئی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ ایک دوسرے کو کئی جانتے بھی تھے، زیادہ سے زیادہ السلام علیکم۔ وعلیکم السلام کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اور حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ اتنے بڑے حادثے پر کسی کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ کہیں سے بھی رونے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بس خاموشی اور صرف خاموشی۔ اسی صورت حال میں ہم ملتان چھاؤنی کے سٹیشن پر اُترے۔ پلیٹ فارم پر ہزاروں کا مجمع تھا اور پورا پلیٹ فارم آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں کراچی کی طرف سے ایک گاڑی آئی اور اس گاڑی میں بھی شاہ جی کے ہی عقیدت مندوں کی اکثریت تھی۔ پلیٹ فام پر اب تل دھرنے کو جگہ بھی نہیں تھی۔ شجاع آباد سے آنے والوں میں مجھے قاضی احسان احمد شجاع آبادی نظر آئے۔ سلام کیا۔ جواب دیا گیا لیکن وہی خاموشی۔ اخبار فروشوں نے پلیٹ فارم پر ہلہ بول دیا۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا ''امیر شریعت وفات پا گئے۔'' ایک اخبار مجھے اب تک یاد ہے روز نامہ امروز خریدا گیا۔ سرخی پڑھی اور پھر اس کے بعد شاہ جی کا ایک پن سکیچ یعنی ہاتھ سے بنا ہوا ایک فوٹو دیکھا تو یک دم قاضی صاحب کے منہ سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا۔ ''اچھا شاہ جی! ہم تو یہ چاہتے تھے کہ آپ ہمارا جنازہ پڑھاتے، آج کا دن کیا کیا دن ہے کہ ہم آپ کا جنازہ پڑھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔'' بس اس کے بعد سب سے پہلے قاضی صاحب کی خاموشی کا بند ٹوٹا انہوں نے بچوں کی طرح جو رونا شروع کیا تو پھر ہزاروں کا مجمع بھی پھوٹ پڑا اور لوگ سارے پلیٹ فارم پر لیٹ لیٹ کر زور زور سے رو رہے تھے۔ کسی کو کسی کی ہوش نہیں تھی لگ بھگ پون گھنٹہ پلیٹ فارم لوگوں کی چیخ و پکار اور آہ و نالہ کے سیلاب میں بہہ کر گم و سم ہو کے رہ گیا تھا۔ پھر مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ ہولناک خاموشی کی اس طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ یہ رونا اس وقت تک جاری رہا جب تک رونے والے کے دلوں پر چھائے اشکوں کے بادل کچھ ہلکے نہیں ہو گئے۔ غبارِ غم ذرا سا چھٹا تو طبیعت سنبھلی۔

تھا بیٹھنے کو دل کا گھروندا کہ دفعتاً
اُمڈا وہ سیلِ اشک طبیعت سنبھل گئی

یہ منظر مجھے آج بھی یاد آتا ہے میں اپنی زندگی میں ایسے کسی دوسرے منظر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہوں تو مجھے ایسا دل خراش اور غم زدہ منظر پوری زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔

بہر حال اعلان ہوا کہ ابھی شہر نہیں جانا۔ نماز فجر پلیٹ فارم پر ہی ادا کی جائے گی۔ چنانچہ نماز فجر پلیٹ فارم پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی ادا کی گئی۔ جس کے بعد ہم سب ٹولیوں میں اپنے اپنے طور پر شہر گئے۔ مجھے تو اقبال فیروز نے جو شورش کاشمیری مرحوم کے ساتھ تھا اپنے ساتھ اُسی تانگے پر بٹھا لیا۔ تانگہ مدرسہ قاسم العلوم کچہری روڈ پر آ رُکا تو ہم شاہ جی کے گھر پہنچ گئے۔ مجھے بھی بیٹھک میں بیٹھنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس وقت کمشنر ملتان ڈویژن کوئی قریشی صاحب تھے نام یاد نہیں رہا، وہ صدر ریاست ایوب خان صاحب کے نمائندے کی حیثیت سے تعزیت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

''حضرات اس انتہائی افسوس ناک اور غم زدہ ماحول میں، میں آپ حضرات سے خصوصاً شاہ جی کی اولاد سے صدر ریاست کی طرف سے تعزیت کرتا ہوا اور یہ بھی کہتا ہوں کہ میں بھی شاہ جی کے عقیدت مندوں میں ہوں اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں ہر طرح کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

کمشنر صاحب نے مزید پیش کش کی کہ آپ قلعہ پر جہاں چاہیں اُن کی قبر بنوا سکتے ہیں اور مجھے اس کا سرکاری طور پر حق حاصل ہے۔ لیکن وہاں صورت حال مختلف تھی۔ قاضی صاحب اور کچھ ملتان کے ساتھی قلعہ پر دفن کرنے کی اس پیش کش کے حق میں تھے۔ ادھر شاہ جی کی اپنی وصیت اس کے خلاف تھی۔ حضرت امیر شریعت نے وصیت فرمائی تھی کہ انہیں عام مسلمانوں کے قبرستان میں بغیر کسی امتیاز کے دفن کیا جائے۔ شاہ جی کے سب بیٹے بھی یہی چاہتے تھے کہ تدفین عام قبرستان میں ہو۔ ایسی جگہ پر جہاں تمام اہل خانہ کی قبروں کی گنجائش بھی ہو۔ اندر سے امّاں جی نے بھی یہی کہلا بھیجا کہ شاہ جی کی قبر کے لیے ہم سرکار کے کیوں ممنونِ احسان ہوں؟ شاہ جی نے جب اپنی پوری زندگی میں سرکار سے اپنی ذات کے لیے کچھ منفعت نہیں اٹھائی تو اب موت کے بعد ہم اُن کی قبر کے لیے سرکار سے درخواست ہرگز نہیں کریں گے۔ بس پھر کیا، فیصلہ یہی ہوا کہ عام قبرستان میں ہی شاہ جی کی تدفین ہوگی۔ ملتان کے مشہور احرار رہنما مظہر نواز خان درانی کے تجویز کردہ جلال باقری قبرستان میں موجود قطعۂ زمین کو شاہ جی کے سفرِ آخرت کی پہلی منزل کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔

اعلان ہوا کہ نماز ظہر کے بعد مدرسہ قاسم العلوم میں شاہ جی کے سب سے بڑے بیٹے حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ کی دستار بندی ہوگی اور اس کے بعد جنازہ اٹھا لیا جائے گا۔ جنازہ پڑھانے کی جگہ کے لیے گورنمنٹ کالج سول لائن کے ساتھ وسیع میدان کا اعلان کیا گیا تھا۔ اقبال فیروز نے مجھے کہا کہ آغا صاحب کہتے ہیں کہیں سے چائے پی جائے، چلو ان کے ساتھ چلتے ہیں۔ چنانچہ اقبال فیروز اور میں دونوں شورش صاحب کے ساتھ گھنٹہ گھر تک گئے اور وہاں ایک دکان سے چائے پی۔ شورش بڑے مضبوط اعصاب کے آدمی تھے، اعضا کی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اُنہیں اس غیر معمولی سانحے پر کتنا شدید کرب ہے۔ وہ انتہائی صبر میں تھے اور شاہ جی کی بہادری اُن کی فصاحت و بلاغت، اُن کی شخصیت پر انتہائی اچھے انداز میں گفتگو کر رہے تھے لیکن چہرے پر لحظہ بہ لحظہ ابھرنے والی کئی شکنیں اور آنے والے کئی رنگ بار بار ٹوٹ جانے والی آواز (جسے وہ کھانسی میں چھپا رہے تھے) اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اس سانحہ کو بھی اسی بہادری کے ساتھ برداشت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس بہادری اور دلیری کے ساتھ انہوں نے پوری زندگی بسر کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہنے لگے آؤ میں تمہیں اس جگہ لے جاؤں جہاں ۱۹۳۹ء کی فوجی بھرتی بائیکاٹ تحریک میں مجھے جلسہ میں پکڑ کر مارا گیا تھا۔ وہ حسین آگاہی کے راستے میں جا کر ایک جگہ رک گئے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے مجھے گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ ملتانی بڑے بزدل ہیں مجھے مار کھاتے دیکھ کر بھاگ گئے۔ کہنے لگے یہاں پر اس وقت کوئی عمارت نہیں تھی ایک کھلا میدان تھا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہم دونوں نوجوانوں کی ڈھارس بندھا بالواسطہ اپنے اندرون ذات میں برپا ہونے والے زہرہ گداز اندوہ کی بے کرانی کا سامنا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہم لوگ جلد ہی واپس آ گئے۔ نماز ظہر ادا ہوئی تو مدرسہ قاسم العلوم میں ہی دستار بندی ہوئی، دستار بندی کا مرحلہ ایک علیحدہ ہی نوعیت کا وقفۂ گریہ وآشوبِ ماتم تھا۔ جس وقت مولانا عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دستِ مبارک سے ابوذر بخاریؒ کے سر پر دستار باندھ رہے تھے تو بے تحاشہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو بھی رہے تھے۔ مولانا محمد علی جالندھری بھی اسی طرح دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ہر ایک فرد جو اس وقت وہاں پر موجود تھا زار و قطار رو رہا تھا۔ ہاں البتہ حضرت مولانا سید ابوذر بخاریؒ صبر واستقامت کا مجسمہ بنے ہوئے انتہائی بہادری کے ساتھ اور صبر کی انتہائی ارفع واعلیٰ کیفیت میں تھے اور مختلف اکابران کے سر پر دستار باندھ رہے تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب کو بھی دیکھا کہ وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک جاتے اور پھر چلنا شروع کر دیتے۔ اُن کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہی رہے۔ میری حالت یہ تھی کہ مجھے اپنے رونے کا بھی ادراک نہیں تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے، ایک مستقل مسلسل زنجیرِ اشک تھی جو آنکھوں سے گویا بندھ کر رہ گئی تھی۔ جب جنازہ اٹھایا گیا تو میں جنازے کے آگے آگے تھا۔ میرا جوتا نیا تھا جو میرے پاؤں کو کاٹ رہا تھا، میں نے جوتا اُتار کر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا، یا یوں کہہ لیجیے کہ لطیفۂ غیبی نے کہا کہ اپنے پیر ومرشد کے جنازے میں جوتے اُتار کے شرکت کرو۔ جنازہ آہستہ آہستہ کچہری روڈ پر آیا لوگ تو گھنٹہ گھر تک جمع تھے۔ میں چونکہ جنازے کے آگے تھا لہٰذا دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ جنازے میں شامل افراد کا آخری سرا دیکھا جائے۔ چوک کچہری میں ایک عمارت کی دیوار پر چڑھ گیا تو دیکھا جہاں تک میری نظر کام کرتی تھی مجھے دوسرے سرے کا کہیں نام ونشان تک نظر نہ آیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ جنازہ اس میدان میں آیا۔ جہاں پر جنازہ پڑھایا جانا تھا۔ جنازے کی چار پائی زمین پر رکھی گئی تو آخری دیدار کو لوگ لپک پڑے۔ ادھر عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا، نمازِ عصر کے بعد جنازہ پڑھایا جانا تھا۔ اس لیے لوگوں کو صف بندی کے لیے کہا گیا۔ لیکن لوگ اپنی محبتوں کے مرکز حضرت شاہ جی کے اس آخری نظارے کو اپنی نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے قید کرنا چاہتے تھے، پروانہ وار آتے تھے اور ایسی سوزش کے ساتھ روتے کرلاتے پلٹ جاتے تھے۔ آخر ہاتھ جوڑ کر امیر شریعت کے نام کا واسطہ دے کر صف بندی کرائی گئی۔ جنازہ پڑھانے کے لیے مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا۔ لیکن انہوں نے کہا کہ جنازہ شاہ جی کے فرزندِ ارجمند مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری پڑھائیں گے۔ چنانچہ جنازہ انہوں نے پڑھایا۔ تو اس کے بعد لوگ پھر آخری دیدار کے لیے ملتجی ہوئے۔ علماء نے کہا کہ جنازے کے بعد تدفین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ ابھی یہ بحث جاری تھی کہ چناب ایکسپریس گاڑی کی سواریاں جو ہزاروں کی تعداد میں تھیں جنازے میں شرکت کے لیے لیٹ پہنچی تھیں۔ وہ آگئیں، انہوں نے جنازے کے لیے اصرار کیا جبکہ جنازہ ہو گیا تھا۔ علماء نے فتویٰ دیا کہ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھایا جائے گا۔ بے انتہا ہجوم کی وجہ سے جنازے کی چارپائی کے ساتھ لمبے بانس گھر سے نکلتے ہی باندھے گئے تھے تاکہ ہر ممکن حد تک محبان امیر شریعت کاندھا دے سکیں۔ جنازہ کی نماز کی ادائیگی کے بعد عشاق کی والہانہ آمد کے بعد وہ بانس بھی ناکافی سمجھے گئے۔ شاید ایک بانس کچھ کمزور بھی تھا۔ چنانچے کچھ دیر کے لیے چارپائی کو رکھ کر مزید لمبے بانس باندھے گئے۔ اس عرصے میں احرار رضا کاران نے چارپائی کے گرد ہاتھوں کا حلقہ بنا رکھا تھا اور یہیں میں نے سب سے پہلی بار امیر شریعت کے فرزندِ ثالث حضرت حافظ سید عطاء المؤمن بخاری مدظلہٗ کو دیکھا۔ انہوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا اور ہجوم میں بھی منفرد نظر آرہے تھے۔ نئے اور مضبوط بانس باندھنے کے بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ قبرستان پہنچے جہاں پر قبر پہلے ہی تیار ہو چکی تھی، شام سے پہلے آپ کی تدفین مکمل ہوئی۔ لیکن لوگوں کی آمد کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ لاکھوں کے مجمع نے جنازہ پڑھا اور جنازے کے بعد بھی ہزاروں لوگ جنازے کی غرض سے آئے مگر جنازہ نہ پڑھ سکے۔ ان دنوں پورے ملک کے اندر سیلاب آیا ہوا تھا۔ سڑکیں بلاک تھیں۔ ٹیکسی، ویگن، بس وغیرہ بالکل بند تھیں اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو مجمع جس نے جنازہ پڑھا اس سے دوگنا ہو ہوتا۔ تدفین کے بعد نماز مغرب ادا کی گئی اور ہم دوبارہ مدرسہ قاسم العلوم چلے آئے۔ اعلان تھا کہ مہمانوں کو کھانا کھلانے کے لیے مدرسہ کے سامنے ایک کپڑے کے کارخانے میں وسیع میدان ہے وہاں پر کھانا کھلایا جائے گا۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد کھانا شروع ہوا تو عشاء کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جس کے بعد لوگ تعزیتی جلسہ میں شرکت کے لیے قلعہ پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ کیونکہ یہ اعلان جنازے کے بعد ہی کر دیا گیا تھا کہ نماز عشاء کے بعد تعزیتی اجلاس قلعہ کہنہ پر ہو گا۔ جس میں رہنمایانِ احرار قائدِ احرار کو اُن کی سیاسی اور دینی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کریں گے۔ چنانچہ نماز عشاء کے بعد میں بھی قلعہ پر پہنچ گیا۔ ابھی ہم ایک جگہ بیٹھے ہی تھے کہ جانباز مرزا کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ہم سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے اور اسے پُرسہ دینے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ لیکن سنبھالے ہی نہیں سنبھلتے تھے۔ بار بار کہتے کہ میں تو راولپنڈی سے بھی دور تھا جب مجھے اطلاع ملی آتے آتے یہ وقت ہو گیا کہ جنازہ بھی نہیں پڑھ سکا۔ بہر حال جلسے کا آغاز ہوا۔ صدارت مولانا تاج محمود صاحب کی تھی اور سارے اکابرِ احرار جن میں مولانا مظہر علی اظہر، ماسٹر تاج الدین انصاری، شورش کاشمیری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولانا محمد علی جالندھری اور غالبًا مولانا عبداللہ درخواستی جو جنازے میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے اور ان کے علاوہ کئی دوسرے حضرات نے بھی اس جلسے سے خطاب کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت یہ ہوش ہی نہ تھا کہ کون آیا ہے کون گفتگو کر رہا ہے۔ بس ایک کلیّتِ غم تھی جس کی کیفیت میں ہر شخص کسی نہ کسی طور پر اپنا حصہ ملا رہا تھا۔ جلسہ رات کے اختتام تک جاری رہا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے میں شرکت کی داستانِ غم کہ جن کی یاد میرے دل سے کبھی محو نہیں ہوتی۔ ان کے یومِ وفات سے اب تک شاید ہی کوئی دن میری زندگی میں آیا ہو کہ میں نے اُنہیں یاد نہ کیا ہو۔ ہر جگہ، ہر وقت اور ہر لمحہ وہ میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے سامنے ہیں اور میں اُنہیں دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں۔ کئی دفعہ خواب میں بھی اُن کی زیارت نصیب ہوئی۔ شورش کاشمیریؒ نے امیر شریعت کے تعزیتی اجلاس میں ایک فقرہ کہا تھا کہ:

''یاد تو انہیں وہ کریں جو اُنہیں بھلا دیتے ہیں، ہم نے تو نہ کبھی اُنہیں بھلایا ہے اور نہ ہی یاد کیا ہے۔

وہ آئے آ کر گئے بھی لیکن نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

ان کے فراق میں میری حالت تو میرے ان شعروں سے واضح ہوتی ہے:

ہیں میرے اطراف میں سپنے تیرے بکھرے ہوئے
کہکشاؤں کی طرح نتھرے ہوئے نکھرے ہوئے
ہجر کے ہاتھوں اگرچہ زندگی ناشاد ہے
تیری یادوں سے مرا دل شاد ہے آباد ہے
شیشۂ دل میں میرے اب تو ہی آتا ہے نظر
سونا سونا سا ہے تیری یاد کا سارا سفر
کیا یہ ممکن ہی نہیں ہے اب تیرا ملنا مجھے؟
کیا نہیں ہے اب میسر زخم کا سلنا مجھے؟
حسرت و یاس و الم کے سارے داغوں کو لیے
ہوں رواں میں راہِ غم میں ان چراغوں کے لیے

(جاری ہے)

☆......☆......☆

© rasailojaraid.com